موسیقی

غبار خاطر

"میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے ان ہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔"

موسیقی*

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے اس کے پاس لاسلکی کا سیٹ ہے۔ کبھی کبھی اس کی آواز یہاں بھی آنکلتی ہے کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی، بی، سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین (Violin) بجانے والا اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ لَے ایسی تھی جیسی کہ Mendelssohn کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سوانگس وِد آؤٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی!

حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنی ست　　بہ نالۂ دَف و نَے در خروش و ولولہ بُود!

ناگہاں ایک مغنیّہ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اُٹھی اور اس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا جس کی طرف خواجۂ شیراز نے اشارہ کیا ہے:

چہ راہ می زند ایں مطربِ مقام شناس　　کہ در میانِ غزل قولِ آشنا آورد!

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا۔ ایسا محسوس ہوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے، لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا تو بدستور انقباض خاطر واپس آگیا تھا!

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شد　　یا کہ خود زخم مرا لذتِ آزار نہ ماند!

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں مجھے فنِّ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور طلبا کو پڑھانے میں مشغول تھا، تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دکان لے رکھی تھی، اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار

---

* یہ اقتباس مولانا کے اُس خط سے ہے جو انہوں نے نواب صدر یار جنگ کو احمد نگر جیل سے موسیقی اور اس کی تاریخ کے بارے میں لکھا تھا۔

کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصوّر نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جو راگ درپن کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کتب خانہ کا تھا، اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس آ گئے جو اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے۔ اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کم سن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کر رہا ہے، متعجب ہوئے، اور مجھ سے فارسی میں پوچھا "یہ کس مصنف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ سیف خاں کی کتاب ہے اور فنِ موسیقی میں ہے۔ انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ ہندوستان کا فنِ موسیقی بہت مشکل فن ہے۔ کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔ انہوں نے ہنس کر کہا، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو تو مجھے اس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ۔ انہوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا، اس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔ بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لے لی اور گھر آ کر اسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہرِ فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی تو طبیعت کو سخت الجھن ہوئی اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے۔ لیکن مدد لی جائے تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم و راہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال مسیتا خاں کی طرف گیا۔ اس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا جس کی ہمارے یہاں گزر تھی۔

اس سیتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا اور پیشہ کا خاندانی گویا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ اور دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلمی کیا کرتا تھا: تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

یہ والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ لیکن اصلاح و توجہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے۔ فرماتے، بغیر بیعت کے آتے رہو۔ دیکھو، خدا کو کیا منظور ہے اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بخود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ چنانچہ سیتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے، تو پہلے کچھ دیر دیوان خانہ میں بیٹھتے، پھر اندر جاتے، خاص خاص مرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے آجاتے اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رخصت ہو جاتے۔ سیتا خاں بھی ہر جمعہ وعظ کے بعد حاضر ہوتا اور دور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والد مرحوم کی نظر پڑ جاتی تو پوچھ لیتے۔ سیتا خاں کیا حال ہے؟ عرض کرتا۔ حضور کی نظرِ کرم کا امیدوار ہوں۔ فرماتے۔ ہاں اپنے دل کی لگن میں لگے رہو۔ وہ بے اختیار ہو کر قدموں پہ گر جاتا اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے انہیں تر کر دیتا۔ ہا، ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا۔ رات کے دربار میں حاضری کا حکم ہو جائے۔ یعنی رات کی مجلس خاص میں جو مریدوں کی تعلیم و ارشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی اسے والد مرحوم ٹال جاتے۔ مگر ان کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا۔ فرماتے، اچھی بات ہے۔ دیکھو۔ ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہیں گی۔ وہ جاں باختۂ امید و بیم اتنے ہی میں نہال ہو جاتا اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ ان معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں:

زحاجب درِ خلوت سرائے خاص بگو "فلاں زگوشہ نشینانِ خاکِ درگہ ماست"!

لیکن بالآخر اس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والد مرحوم نے اسے مرید کر لیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی معلمی

سے تائب ہو گیا اور ایک بنگالی زمیندار کی ملازمت پر قناعت کر لی۔ والد مرحوم کو میں نے ایک مرتبہ یہ کہتے سنا تھا کہ مسیتا خاں کا حال دیکھتا ہوں تو پیر چنگی کی حکایت یاد آجاتی ہے یعنی مولانا روم والے پیر چنگی کی:

پیر چنگی کے بود مردِ خدا　　حبذا اے سرِ پنہاں حبذا

بہر حال میرا خیال اسی مسیتا خاں کی طرف گیا اور اس سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ پہلے تو اسے کچھ حیرانی سی ہوئی، لیکن پھر جب معاملہ پوری طرح سمجھ میں آگیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادہ کی نظرِ توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے لیکن اب مشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سارا، گاما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا، اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہر حال اس مشکل کا ایک حل نکال لیا گیا اور ایک راز دار مل گیا جس کے مکان میں نشست و برخاست کا انتظام ہو گیا۔ پہلے ہفتہ میں تین دن مقرر کیے تھے۔ پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا۔ مسیتا خاں پہلے سے وہاں موجود رہتا اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا:

عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف　　چوں ہنر ہائے دگر موجبِ حرماں نہ شود

مسیتا خاں نے تعلیم کا صرف ایک ہی ڈھنگ رٹا ہوا تھا جو اس فن کے استادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے۔ وہی اس نے یہاں بھی چلایا، لیکن میں نے اسے روک دیا اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مرتب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے۔ میری عمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی لیکن اس وقت بھی طبیعت کی افتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اٹھایئے پوری طرح اٹھایئے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جایئے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہیں ہوئی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اٹھایا، اسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کیے تو وہ بھی پوری طرح کیے، گناہ کے کام کیے تو انہیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے، پارسائی کی راہ ملی تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔ رسم و راہ رکھیے تو راہ کے کاملوں

سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تادست رسم بود زدم چاکِ گریباں　　شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم!

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ مل سکی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی، بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں لیکن زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ شغلہ یک قلم متروک ہو گیا، اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اٹھ نہیں سکتی:

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

اور ایک بھنورے کی ہوئی کہ ہر پھول پر بیٹھے، بو باس لی، اور اڑ گئے:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے!

چنانچہ زندگی کے چمنستانِ ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا کچھ دیر کے لیے رک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے، کیونکہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا، تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی　　دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محرومِ ازلی پر، جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو!

سینۂ گرم نہ داری مطلبِ صحبتِ عشق   آتشے نیست چو در مجمرات، عود مخر!

میں آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا، اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

رُوئے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ست   ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند!

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہیں تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانے میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے تو وہ ریڈیو سیٹ کا فقدان ہے:

لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ   خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی!

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویّت کے بعض ناقابلِ فراموش احوال پیش آئے۔ جو اگرچہ خود گزر گئے، لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ گئے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا۔ اور اس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں:

گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم!

رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی اَن گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے، اور ہوا کی لہروں پر

بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے:

زخمہ برتارِ رگِ جاں می زنم کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آآ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ مینارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں، اور جب کبھی تاج کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کی لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے